نسرین اختر

مومن کی فارسی شاعری

ابتدا ہی سے فارسی زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے اسلوب میں بھی خاصی ترقی نی رہی، مگر جو اسالیب یا سبکِ شعر زیادہ مشہور ہیں وہ سبکِ خراسانی، سبکِ عراقی اور سبکِ ندی ہیں۔

مومن خاں کا تقریباً تعلق آخری سبکِ شعر یعنی سبکِ ہندی سے ہے۔ اُن کے کلام میں ں اسلوب کی جملہ خصوصیات موجود ہیں، اس لیے یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "سبکِ ہندی" ھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے تاکہ یہ سبکِ شعر کما حقہٗ واضح ہو سکے۔

فارسی شاعری کا یہ اسلوب دوسرے اسالیب یعنی سبکِ خراسانی اور عراقی سے بالکل مختلف ہے۔ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ جب ۴۳۰ ہجری کو ایران میں سلجوقی دور کا آغاز ہوا تو اس وقت اسی قبیلے کے کچھ لوگوں نے روم میں بھی سلجوقی حکومت قائم کر لی تھی۔ یران اور روم کے سلجوقی ایک نسل سے تھے، اس لیے اُن کے باہمی ربط و تعلق کی وجہ سے ومی دربار میں فارسی زبان کا استعمال شروع ہو گیا اور پھر اسی زمانے میں ایران سے کئی عارف شلاً نجم الدین رازی اور مولانا روم کے والد مولانا بہاء الدین بھی روم میں چلے گئے اور قونیہ میں آباد ہو گئے۔ اس طرح فارسی ادب کی اور بھی اشاعت ہوئی، اور فارسی اور ترکی کے امتزاج سے ایک نیا فارسی ادب پیدا ہو گیا۔ اس سے فارسی ادب کی ایک نئی روایت قائم ہوئی۔

اس نئے فارسی ادب میں یہ خصوصیت ابھری کہ کلمات، اصطلاحات اور تراکیب تو وہی ایرانی رہیں لیکن اندازِ فکر رومی ہو گیا، اور یہ مخصوص انداز "نازک خیالی" اور "خیال بندی" کہلایا۔ خیال بندی ترکوں کے مزاج کا خاصہ تھا، اس لیے ترکوں کے اثر کے ساتھ فارسی شعر و ادب میں یہ خیال بندی کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ پھر اس سے وہ ایرانی شعرا بھی متاثر ہوئے جو تیموری اور ترکمان درباروں سے وابستہ تھے۔

جب ہم فارسی ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو سبک عراقی کے آخری دور میں وہ سبک ہندی کے ابتدائی آثار اس زمانے کی شاعری میں تھوڑے بہت نظر آتے ہیں لیکن جامی کے بعد تیموری دور میں تو یہ سبک ہندی پورے طور پر ابھر آیا۔ ہرات کے تیموری سلاطین خصوصاً سلطان حسین بایقرا اور اس کا ادب پرور وزیر میر علی شیر نوائی تو اس فن کے شیدائی تھے، انھوں نے اس شعری رجحان کو بہت فروغ دیا۔ چنانچہ یہ اندازِ فکر ہمیں پہلی مرتبہ اپنی ابتدائی شکل میں بابا فغانی کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں:

خوبی ہمین کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتان را کہ نام نیست

اس کے بعد "سبک ہندی" دسویں، گیارھویں اور کسی حد تک بارھویں صدی تک گویا تین صدیوں تک فارسی شاعری پر پورے زور شور سے مسلط رہا۔ لیکن خیال بندی کا اسلوب ایرانی شعرا کو پسند نہ تھا اس لیے انھوں نے تھوڑے عرصے کے بعد ترک کر دیا اور اپنے اشعار کو قدیم شعری دبستانوں کی طرف منعطف کر لیا، مگر ایران سے باہر فارسی شعرا نے اس کی پیروی کو جاری رکھا اور برابر اس انداز میں شعر کہتے رہے۔ خاص طور پر ہندی ذہنوں سے یہ اسلوب قریب تر تھا اس لیے برعکس ایرانی شعرا کے ہندوستان کے شعرا نے اس سبک شعر کو ترقی دے کر بام عروج تک پہنچا دیا۔

ہندوستان میں جو بھی فارسی شاعر اور ادیب آتے وہ اپنے آپ کو مذہبی، ثقافتی، ادبی، لسانی، تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے ایک مختلف ماحول میں پاتے اور لازمی طور پر اس سے متاثر ہوتے، کیونکہ ان سے پہلے فارسی شاعروں اور ادیبوں نے خواہ وہ ایرانی تھے یا ہندوستانی، ادبی میدان کو یہاں کے مذاق سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔ امیر خسرو اور امیر حسن دہلوی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پاک و ہند کی سرزمین میں "سبک ہندی" کی بنیاد رکھی۔ ان دو شاعروں کے بعد بعض اور شاعروں نے بھی فارسی میں شعر کہے، لیکن ان کا کلام زیادہ مشہور نہیں۔ بہرکیف ان کے ذریعے فارسی ادب نے بہت فروغ پایا۔ یہاں تک کہ نویں صدی ہجری میں ہندوستان میں مغلیہ خاندان نے اپنی عظیم الشان حکومت کی بنیاد رکھی، جن کے حکمرانوں میں اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب خاص طور پر معروف ہیں۔ ان بادشاہوں کے عہدِ سلطنت میں ہندوستان میں فارسی زبان و ادب نے بہت ترقی کی اور ایران کے بڑے بڑے شاعر مغلیہ دربار میں آ گئے۔ اس کے برعکس یہی زمانہ ہے جب ایران میں فارسی کا بازار کاسد ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ایران میں صفویوں کی حکومت

ئی۔ ان کے عہد میں دو وجوہ سے فارسی شاعری زوال پذیر ہوئی۔ اول یہ کہ یہ بادشاہ اپنا تمام وقت دوسرے ممالک کے ساتھ جنگ میں گزارتے تھے اور دوسرے یہ کہ ان کی حکومت کی بنیاد مذہب تشیع پر استوار تھی جس کی وجہ سے ان کے دربار شعر و شاعری کے دربار نہ رہے تھے اور نہ انھیں مدح سرائی پسند آتی تھی۔ اسی لیے ہندوستانی بادشاہوں کی شاعر پروری اور ایرانی سلاطین کی شعر و شاعری سے یہ بے اعتنائی اس بات کا باعث بنی کہ فارسی ادب کا مرکز ایران کی بجائے ہندوستان میں منتقل ہو گیا۔ اس دور کے شعرا کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اول وہ شعرا جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اس اعتبار سے ہندی الاصل فارسی شاعر تھے۔

دوسرے وہ جو ایران سے ہندوستان میں آئے اور تا عمر اسی سرزمین میں رہے۔

تیسرے وہ شعرا جو کسب معاش کے لیے برّصغیر ہند میں آتے تھے اور پھر ایران لوٹ جاتے تھے۔ اس آمد و رفت اور اختلاط و امتزاج کا نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی شاعری میں ایک نئے سبک کی بنیاد پڑی جو "سبکِ ہندی" کے نام سے مشہور ہوا۔[1]

چنانچہ اکبری دور کے اکثر شعرا، مثلاً فیضی، نظیری اور عرفی بھی اسی نئی ادبی روایت یعنی سبکِ ہندی کے پیرو ہیں۔ پھر جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد میں طالب آملی، صائب اور قدسی مشہدی نے بھی اسی سبک شعر میں طبع آزمائی کی اور جو نغمے الاپے ان کا سلسلہ بیدل اور ناصر علی سرہندی سے ہوتا ہوا غالب اور مومن تک پہنچا۔

سبکِ ہندی کی جملہ خصوصیات میں سے ایک خاصیت "مبالغہ" ہے۔ مبالغہ اس سبک میں اتنا زیادہ اور قوی ہو گیا کہ شعرا کسی معمولی چیز کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے اور شعر اپنی سادگی اور فطری روش سے بہت دور جا پڑتا، مثلاً:

دل آسودہ ای داری مپرس از صبر و آرامم نگین را در فلاخن می نہد بیتابی نامم

یہاں شاعر چاہتا ہے کہ اپنی بے تابی اور بے قراری بیان کرے، اس لیے کہتا ہے کہ میرا اضطراب میرے نام پر بھی اثر انداز ہوا۔ میری انگشتری کا نگینہ جس پر میرا نام کندہ ہے، اس پتھر کی مانند ہے جو منجنیق

---

[1] رسالہ "اقبال"، اکتوبر ۱۹۶۵، ص ۴۹، ۵۰۔

میں ہر لحظہ مضطرب اور بے تاب ہو۔

بعض سیاسی اور فطری وجوہ کی بنا پر اہلِ ہند کے خیالات توہّم و تخیل اور باریک و لطیف معانی کی طرف بہت مائل ہیں اور اس طرزِ بیان کے لیے جو اصطلاح خود اہلِ ہند نے منتخب کی، وہ "خیال بندی" ہے۔ جو سبکِ ہندی کی اہم خصوصیت ہے، سبکِ ہندی کے شعرا، ایک خیال سے کچھ اس طرح نکتہ آفرینیاں کرتے چلے جاتے ہیں کہ شعر فکر کا ایک تارِ عنکبوت بن کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً عرفی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آن کہ چون در کتف چتر ہمایوں آثار | ہم عنان ظفر از راہِ غزا گردد باز
زہرہ گیسو بکشاید کہ شود گرد فشان | از رکابش بپذیرفتہ غبار از تگ و تاز
فتح گوید چہ کنی چشم من است این نہ رکاب | سرمہ چشم جہان بین مرا پاک مساز

غالب نے ایک سادہ سی بات کو رشتۂ عنکبوت میں یوں پرو دیا ہے:

دمید دانہ و بالید و آشیان گہ شد | در انتظار ہما دام چیدہ نم بنگر [۵۲]

خیالی اور وجدانی باتوں کو مجسم صورت میں پیش کرنا بھی سبکِ ہندی کا خاصہ ہے۔ ہند کے قدیم باشندے شروع ہی سے یقین رکھتے تھے کہ کوئی مافوق الفطرت طاقت موجود ہے جو اچھے کاموں کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا دیتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے خالق کائنات کی صفات کو ظاہر کرنے کے لیے مٹی اور پتھر کے بت تراشے اور اپنے تصور کو آسان بنانے کے لیے تجسیم کا سہارا لیا۔ پھر اسی طرح ایران کے زرتشتی یقین رکھتے تھے کہ خدا مجسمۂ نور ہے، لہٰذا انھوں نے اپنے اعتقاد کو راسخ تر کرنے کے لیے تجسیم کو وسیلہ بنایا اور آتشکدہ کی صورت میں نور کو مجسم کر دیا۔

"پھر تجسیم کے اسی تصور نے ادبیات میں راہ پائی اور شعر و شاعری میں دخیل ہو گیا۔ شعرا، خیالی اور وجدانی باتوں کو مادیات کی صورت میں اس طرح ظاہر کرنے لگے کہ وہ مجسم ہو کر سامنے آ جائیں۔ مثلاً محبوب کی ہر ادا دل نشین ہوتی ہے، لیکن ان اداؤں کا تعلق ذوق و وجدان سے ہے، ان کا اپنا کوئی وجود ظاہری نہیں ہوتا۔ ان کا ذکر نظیری نے اس طرح کیا کہ وہ گویا مجسم چیزیں ہیں:

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم | کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست [۵۳]

---

[۵۲] دیوان عرفی

[۵۳] دیوان نظیری، مطبوعہ تہران

اور دوسرے شعر میں :

نبیداد تو حرف مہر را نام و نشان گم شد　　کتابِ حسن را جزوِ محبت از میان گم شد

یعنی یہ کہنا تھا کہ محبوب بہت ستم گر ہے، اس کی بے اعتنائی کا کوئی ٹھکانہ نہیں، گویا معلوم ہوتا ہے کہ مہر و محبت عنقا ہو چکی ہے۔ مہر و محبت کے عنقا ہونے کو یوں مجسم کر کے پیش کیا ہے کہ حسن ایک دل فریب کتاب ہے، جس کے متعدد اجزا ہیں۔ ایک جزو کا نام مہر و محبت تھا لیکن اب یہ جزو کتابِ حسن سے پیدا ہو چکا ہے[۵۴]۔"

سبکِ ہندی کے پیرو شاعر اپنے کلام کو نادر اور خوبصورت تشبیہات اور استعارات سے مزین کرتے ہیں۔ شاعری ایک شدید اندرونی کشمکش اور تصادم کی پیداوار کا نام ہے۔ داخلی شاعری میں شاعر خود اپنے نفس کا تجزیہ کرتا ہے۔ کبھی اپنی زخمی انفرادیت کے اظہار کے لیے کرب کی راہوں سے گزرتا ہے اور اُسے اپنے نقوش کے نامکمل اور ادھورے رہ جانے کا احساس رہتا ہے، اور کبھی اُمید بر آنے پر خوش ہوتا ہے۔ لہٰذا اسی سے وہ اپنے قلبی احساسات کی عکاسی کرتا رہتا ہے، ورنہ انسانی قلب بھی تو ایک وسیع طلسم خانہ ہے جس کا مکمل جائزہ لینا انسان کے بس کی بات نہیں، پھر زبان و بیان بھی قلبی واردات و احساسات کا ساتھ نہیں دے سکتے، اس لیے شاعر مجبور ہو جاتا ہے کہ رمز و ایما سے کام لے، پھر اس کے تخیل کی بیباکی تشبیہات و استعارات کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نادر تشبیہیں اور استعارے استعمال کر کے اپنے کلام کو دلکش اور رنگین بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ سبکِ ہندی کی یہ خصوصیت زیادہ تر اُن فارسی شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے، جنھوں نے ہندوستان کے ماحول میں نغمہ سرائی کی ہے۔ اسی لیے عرفی، نظیری، بیدل اور غالب کے کلام میں خوبصورت تشبیہات اور استعارے نظر آتے ہیں، مثلاً غالب کا یہ شعر :

بوادیٔ کہ در آں خضر را عصا خفتہ است　　بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفتہ است[۵۵]

"خاص بات جو سبکِ ہندی میں نظر آتی ہے وہ ذوقِ تنوع ہے، اس سبک کے شاعر چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ کہیں جدید اور تازہ ہو۔ پیش پا افتادہ مضامین کی تکرار انھیں گوارا نہیں تھی۔ چنانچہ شعری زبان

---

[۵۴] ادب نامۂ ایران: میرزا مقبول بیگ بدخشانی، لاہور، ص ۲۰۷　[۵۵] دیوانِ غالب

میں سست اور مبتذل الفاظ کے داخل ہونے کا ایک بڑا سبب یہی ذوقِ تنوع تھا، جس کی تسکین کی خاطر شعرا ہر اس مضمون کو باندھتے جو انھیں جدید اور بدیع نظر آتا اور ہر اس لفظ کو استعمال کرتے جو انھیں تازہ اور غیر مستعمل دکھائی دیتا۔ مثلاً کلیم کا یہ شعر:

باریک بینیت چو ز پہلوی عینک است　　　باید ز فکر دلبر لاغر میان گزشت

پہلی بار ہے کہ فارسی شاعری میں "عینک" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ "پہلوی عینک" کی ترکیب نہ صرف ... بلکہ مضحکہ خیز ہے کیونکہ قدما نے کبھی کبھی لفظ "پہلو" کو کنار اور گوشہ کے معنوں میں استعمال نہیں کیا۔

پھر عرفی شیرازی کا یہ شعر:

بخیہ کفشم اگر دندان نما شد عیب نیست　　　خندہ آرد کفش من بر ہرزہ گردیہائی من

یعنی جدت اور ذوقِ تنوع اس امر کا موجب بنے ہیں کہ شاعر نے لفظ "بخیہ" کو فارسی شعر میں داخل کر لیا ہے۔ بخیہ کفش کو دندان نما کہنا کس قدر مبتذل ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ شاعر کے جوتے کو اس کی آوارہ گردی پر ہنسی آتی ہے، ایک نہایت پست اور مہمل مضمون ہے۔ سبکِ ہندی کے شعرا کا نصب العین محض ذوقِ تنوع تھا۔ خواہ اس تنوع میں فصاحت ہو یا نہ ہو۔[۵۵]

یہ خصوصیت سبکِ ہندی میں اس وقت شامل ہوئی جب فارسی شعرا نے جامۂ حرف کی تنگی محسوس کیا اور انھیں یہ احساس ہوا کہ جس طرح ہر جان کے لیے اس کا الگ جسم ہوتا ہے، اسی طرح ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے خاص اور الگ الفاظ ہونے چاہییں، کیونکہ الفاظ ہی حقیقت کے ابلاغ کا ذریعہ ہوتے ہیں، اس لیے شعرا نے نئی نئی تراکیب اختراع کیں جس سے یہ سبکِ مبتذل ہو گیا اور ان کے کلام میں پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔

اس کے علاوہ غنائیت بھی سبکِ ہندی ہی کی خاصیت ہے۔ پاک و ہند میں موسیقی کا شروع سے رواج رہا ہے۔ حتیٰ کہ مذہبی مجالس اور صوفیائے کرام کی مجالس میں بھی اس کا دخل کم از کم سماع کی صورت میں تھا۔ یوں تو موسیقی کے سریلے سُروں کے سحر نے ہر انسان کو اپنی طرف کھینچا، مگر فنا کی حساس طبیعت نے اُسے اور مقبولیت بخشی۔ یوں بھی شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ

---

۵۵ مجلہ اقبال: اکتوبر ۱۹۶۵ - ص ۵۱، ۵۲

ہے۔ لیکن سبکِ ہندی کے شعرا میں یہ خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ اکبری دربار میں جہاں فصیح سخن شاعر موجود تھے، وہاں موسیقاروں اور رقاصوں کی بھی کثرت تھی، جن کی لطیف صداؤں نے ذوقِ شعر کو متاثر کیا اور اس طرح نغمہ و شعر کے امتزاج سے فارسی شاعری میں نئی روح پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس دور کے مشہور شعرا فیضی اور نظیری کے کلام میں غنائیت کا عنصر اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ مثلاً نظیری کے یہ شعر:

بزیرِ شاخِ گُل افعی گزیدہ بلبل را ۔۔۔ نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

زدامنی کہ کشائیم ما تہی دستان ۔۔۔ تو میوۂ سرِ شاخ بلند را چہ خبر

میرزا غالب کے کلام میں بھی موسیقی اور غنائیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

زمن بجرم تپیدن کنارہ میکردی ۔۔۔ بیا بخاکِ من و آرمیدیم بنگر

سبکِ ہندی کی ایک اہم خصوصیت صنعتِ ابہام ہے، جس میں شاعر یہ طرز اختیار کرتا ہے کہ تاثیر، جذبہ یا خیال کی تشریح کے لیے ایسی دو اشیا کے دوران مشابہت اور مماثلت قائم کرتا ہے جو بادی النظر میں ایک دوسرے سے کئی مراحل دُور ہوتی ہیں لیکن غور کرنے سے ان میں گہری اندرونی وابستگی پائی جاتی ہے، اس کی وجہ سے کلام پیچیدہ، مشکل اور مبہم ہوجاتا ہے:

اور پھر اسی طرح سبکِ ہندی کے پیرو شعرا کے کلام میں مقدرات اور محذوفات بہت زیادہ ہیں۔ اس میں شاعر اپنے خیالات اور مقصود کی طرف لطیف اشارہ تو کرجاتا ہے لیکن تفصیل حذف کرجاتا ہے۔ ان اشاروں میں ربط پیدا کرنا اور خیالات کی بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑنا قارئین پر چھوڑ دیتا ہے، یعنی اس طرح سے وہ اپنے فکری پہلو کا خاکہ تو پیش کر دیتا ہے مگر اس خاکے میں رنگ آمیزی پڑھنے والوں کے ذوقِ طبع پر چھوڑ دیتا ہے۔ سبکِ ہندی کی یہ خصوصیت کلام کو بہت دقیق اور عمیق بنا دیتی ہے جس سے پڑھنے والے کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

"اس کے علاوہ سبکِ ہندی کے شعرا اپنی بلندیٔ مقام اور عالی گوہری کا ذکر اپنے کلام میں بڑے فخر اور غرور سے کرتے ہیں اور کسی دوسرے کو اپنا ہم سر اور ہم پایہ نہیں مانتے۔ گویا شاعرانہ تعلی سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً صائب اپنے ایک شعر میں کہتا ہے:

زصد ہزار سخنور کہ در جہان آید ۔۔۔ یکی چو صائب شوریدہ حال برخیزد[۵]

---

[۵] ادب نامۂ ایران، میرزا مقبول بیگ بدخشانی۔ ص ۲۰۷، ۲۰۸

سبکِ ہندی میں جب مبالغہ، خیال بندی اور مضمون آفرینی اپنی انتہا کو جا پہنچی تو یہ سبک فاسد ہو گیا۔ ا
دَور کے بڑے بڑے شعرا عرفی، نظیری، فیضی، صائب اور کلیم ہیں۔ بعد ازاں جب شعرا نے احساس کے د
کو بالکل ترک کر دیا اور صرف خیال بافی کو اپنا نصب العین ٹھہرا لیا تو یہ سبک خراب ہو گیا۔ جلال اسیر
زلالی خوانساری، اور میرزا عبدالقادر بیدل کے ہاتھوں سبکِ ہندی اپنے انتہائی نقطۂ زوال تک جا پہ
اس کے بعد خوش ذوق شعرا کے لیے یہ سبک ناقابلِ تحمل بن گیا۔ بارہویں صدی ہجری میں فارسی شاعری ا
انتہائی زوال اور انحطاط کے مراحل طے کر رہی تھی، شعر جس قدر آگے بڑھ رہا تھا، اسی قدر سست اور بے
ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ آخر میں یہ نکلا کہ اس زمانے میں چند شعرا جمع ہوئے اور انھوں نے ایک نئے سب
کی بنیاد رکھی، جسے فارسی شاعری کے تحول کی تاریخ میں "بازگشت ادبی" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں
شعرا چاہتے تھے کہ شعر کو اس کی موجودہ حالت سے نجات دلائیں، لیکن ان کی یہ کوشش کسی نئے سبک کی ایجا
کی طرف متوجہ نہ ہوئی بلکہ نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی شاعری دوبارہ بہت حد تک سبکِ عراقی اور کسی حد تک سبک
خراسانی کی طرف مائل ہو گئی۔ . . . لیکن جو تحریک سبکِ ہندی کو تبدیل کرنے کے لیے صفوی دور کے
بعد شروع ہوئی وہ ایرانی حدود سے تجاوز نہ کر سکی۔ چنانچہ فارسی شاعری نے ہر جگہ منجملہ برصغیر پاک
ہند میں اپنی اسی روش کو جاری رکھا۔ جو شعرا ان ممالک میں شعر کہتے تھے انھوں نے اس اسلوب کو
ترک نہ کیا، البتہ بعض جدید اصطلاحات اور الفاظ کو اپنے شعری قوالب میں ڈھالتے اور اپنے مضا
اور مطالب کو اس معمولی سے تغیر کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔[۵۸]

حتیٰ کہ نوبت مومن تک پہنچی، ان کے کلام میں سبکِ ہندی کی جملہ خصوصیات کثرت سے نظر آ
ہیں۔ گو مومن کے کلام میں سہلِ ممتنع کے نمونے بھی ملتے ہیں لیکن زیادہ تر سبکِ ہندی ہی کی خصوصیات پائی
ہیں، جو کلام کو پیچیدہ، دقیق، عمیق اور مشکل بنا دیتی ہیں۔ خیال بندی کا عنصر ان کے ہاں کمال
پہنچا ہوا ہے۔ تجسیمِ معانی کے مکمل، دلآویز اور دلکش نمونے ان کے اشعار میں موجود ہیں، اور سب
سے بڑھ کر شاعرانہ تعلّی جو سبکِ ہندی کی اہم خصوصیت ہے، مومن کے ہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی
اسے اپنی عالی گوہری کا احساس ہے، جس کا ذکر وہ اکثر اشعار میں کرتا ہے۔ مثلاً اپنے ایک قصیدے

---

۵۸ مجلہ اقبال: مقالہ از ڈاکٹر محمد اکرم، ص ۵۳، ۵۴، ۵۵

میں اپنا مقابلہ فارسی کے مشہور ترین شعرا انوری اور ابوالفرج سے کرتا ہے۔

رتبہ ام گلشنی کجا باید — کی بریحان رسد خس و خاشاک

انوری گر مہ است، من خورشید — بوالفرج گر زر است، من سباک

اس کے علاوہ مومن نے اپنے کلام کو نادر تشبیہات سے بھی مزین کیا ہے اور نئی فارسی ترکیبیں ایجاد کرکے اپنے اشعار کو رنگین بنایا ہے۔ پھر حروف کے تکرار، اور ہم آہنگ حروف کے امتزاج سے موسیقی و نغمہ کی کیفیت بھی پیدا کی ہے۔ محذوفات کا جو سبکِ ہندی کی اہم خصوصیت ہے، اگر مومن کو بادشاہ کہیں تو بے جا نہیں۔

اب ہم مومن کی شاعری، اس کی پسندیدہ اصنافِ سخن، اس کی تقلید اور اس کے شاعرانہ مقام پر ایک جامع مگر مختصر بحث کرتے ہیں۔

مومن کی شاعری

یوں تو مومن نے کئی علوم و فنون میں مہارت حاصل کی تھی مگر بنیادی طور پر وہ ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور یہی ان کا خاص فن تھا۔ انیسویں صدی کے شاعرانہ ماحول میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ مومن کو شعر و شاعری سے قدرتی لگاؤ تھا۔ چنانچہ لڑکپن ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ ان دنوں دہلی کی فضا مشاعروں کے غلغلوں سے گونج رہی تھی۔ شعر گوئی کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ اس کی شہرت سات سمندر پار تک پہنچ چکی تھی۔ اکثر ذی استطاعت اور صاحبِ ذوق اشخاص اپنے گھروں میں مجالس مشاعرہ منعقد کرتے، جن میں شہر کے مشہور شعرا شوق سے شرکت کرتے۔ ظاہر ہے کہ مومن جیسے ذی شعور انسان نے جب اس فضا اور شاعرانہ ماحول میں آنکھ کھولی ہوگی تو اُن کے جوہرِ خداداد نے اُن کی آتشِ شوق کو بھڑکایا ہوگا۔ شاہ نصیر اس زمانے کے مشہور شاعر تھے جو قادر الکلامی میں شہرہ آفاق اور شاعری میں سنگلاخ زمینوں کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے، مومن شروع میں انہی کے شاگرد ہوئے، مگر استاد اور شاگرد کے مزاج میں بُعد المشرقین تھا، اس لیے یہ رشتہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور مومن دو چار غزلیں دکھا کر الگ ہوگئے اور پھر اپنی طبیعت ہی سے مشورہ کرتے رہے اور زندگی بھر ذوقِ سلیم ہی کو اپنا راہبر بنائے رکھا۔

اس کے متعلق مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

شعر و شاعری میں انھیں طبعی مناسبت تھی، اور عاشق مزاجی نے اُسے اور بھی چمکا دیا تھا۔ انھوں نے

ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا مگر چند روز کے بعد ان سے اصلاح لینا چھوڑ دی اور پھر کسی کو استاد نہیں بنایا[۹]

اسی طرح عبدالغفور نساخ لکھتے ہیں:

"ایک یا دو غزلوں میں نصیر دہلوی سے اصلاح لی تھی مگر اصلاح پسند نہ آئی"[۱۰]

کریم الدین رقمطراز ہیں:

"اصلاح شعار کی شاہ نصیر سے انھوں نے لی ہے، مگر فنونِ نظلیہ کے خدا نے ان کو وہ بہرہ دیا کہ تمام اقران پر سبقت لے گئے"[۱۱]

ان تذکروں سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ مومن نے شاعری میں شاہ نصیر کو اپنا استاد تسلیم کیا تھا اور ان سے چند غزلیات میں اصلاح لی تھی، مگر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کیوں اس استادی شاگردی کے رشتے میں منسلک نہ رہ سکے، اس کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا۔

بہرحال ان کی باقاعدہ شاگردی کا سلسلہ نظر نہیں آتا۔ انھیں اپنے کمالِ جوہر کا اس قدر احساس تھا کہ وہ بڑے بڑے شعرا کو نظر میں نہ لاتے تھے، بھلا شاہ نصیر کی استادی کیسے قبول کرتے، اپنے کلام میں بھی وہ اس کا اظہار کرتے ہیں اور مبدائے فیاض کے سوا کسی کے احسان مند نظر نہیں آتے۔

ان کی شاعری کا آغاز غزل سے ہوا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے دوسرے اصنافِ سخن پر بھی طبع آزمائی کی اور بہت جلد تمام اصناف پر عبور حاصل کر لیا، جس کی طرف نور الحسن نے یوں اشارہ کیا ہے:

"بر جمیع اصنافِ سخن قادر بود، از لطائف شعر و شاعری کما حقہٗ ماہر، بقوت سخن وری مثل مومن کم تر کسے برخاستہ و ہر دو لفظ چندان دست گاہی نصیب او گشتہ کہ پارسیاں از ان خود می انگارند و ہندیاں بشرف ہم زبانی او نازہا دارند، دیوانش مملو از اصنافِ سخن است"[۱۲]

اسی طرح نساخ کہتے ہیں:

جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ اشعار ان کے پُر مضمون، شیریں، عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں[۱۳]

---

[۹] آبِ حیات، ص ۴۲۳ [۱۰] سخنِ شعرا، ص ۴۷۰ [۱۱] طبقات شعرائے ہند، ص ۴۴۳

[۱۲] طور کلیم، ص ۹۷ [۱۳] سخن شعرا، ص ۴۷۰

غرض کہ مومن نے شعر و شاعری میں بہت جلد کمال حاصل کیا اور تمام اصنافِ سخن پر قادر ہو گئے۔ انھوں نے غزلیں کہیں، قصیدے لکھے، رباعیات کو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا، اور فارسی زبان میں مختلف اصنافِ سخن کو چار چاند لگا دیے، اور تھوڑے ہی عرصے میں فارسی اور اردو کے قادر الکلام اور خوش فکر شاعر کی حیثیت سے استاد کے رتبے تک پہنچ گئے۔

مومن کا فارسی کلام ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس کے چھپوانے کا سہرا حکیم احسن اللہ کے سر ہے۔ یہ دیوان انھوں نے ۱۲۷۱ھ میں یعنی مومن کی وفات کے تین سال بعد چھپوایا تھا۔ ان کی فارسی شاعری کے بارے میں میرزا قادر بخش صابر لکھتے ہیں:

"ہر چند زبان اردو میں تو علم یکتائی بلند تھا ہی، لیکن کمال مہارتِ فارسی سے کوسِ لمن الملک کی صدا نے ہند سے فارس تک پہنچ کر طوطیٔ ہند و بلبلِ شیرازہ کو دم بخود کر دیا، غزلہائے فارسی کا غنچہ ہائے پراگندہ پر مثبت اور بالفعل محبت طبعی اور قرابت قریبہ کے تقاضے سے اس کی تبییض میر عبدالرحمن آہی تخلص، خلف میر حسن تسکین کے عہدۂ اہتمام میں ہے اور جو کہ وحیدِ عصر، نسیج وحد، جالینوس زمان، حکیم احسن اللہ خان سلمہ الرحمن کو شفائے مرضی کے اہتمام سے قدم بڑھا کر احیائے اموات اور معجزۂ مسیحائی کی ترویج پیش نہاد ہے۔ قریب ہے کہ وہ دیوان منصۂ طبع میں جلوہ گر ہو کر شہرت تمام پیدا کرے"[1]

مومن خان نے حسبِ دستور استادانِ ایران او رہند کے کلام کا مطالعہ کیا اور جس باکمال شاعر کا انداز ان کے دل میں کھبا ہوا نظر آتا ہے اور جس کی تقلید کرنا باعثِ فخر جانتے ہیں وہ "عرفی" ہے۔ اس کی زمینوں میں انھوں نے کئی غزلیات اور قصیدے کہے ہیں اور ایک قصیدے میں خود کہتے ہیں:

مومن شدہ ہم زبانِ عرفی از بہر امان آفرینش

غرضیکہ مومن کے پیش نظر اعلیٰ معیار کی شاعری تھی۔ انھوں نے شعر ہی نہیں کہے بلکہ شاعری کا صحیح ماحول پیدا کیا۔ شاعری کو دنیاوی عزت و دولت کا وسیلہ بنانا انھیں ہرگز پسند نہیں تھا۔ البتہ مشاعروں میں ضرور شرکت کیا کرتے تھے۔ مومن کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے مشہور ہے۔ وہ اپنی غزلیات میں ان جذباتِ عشق کی ترجمانی کرتے ہیں جو ان کے دل پر گزرتے ہیں اور مصنوعی جذبات سے کسی حد تک

---

[1] [illegible]

پرہیز کرتے ہیں، جس عشق کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ عشقِ حقیقی نہیں بلکہ عشقِ مجازی ہے جس کا ذکر کلیم الدین احمد نے یوں کیا ہے :

"مومن اپنے مخصوص رنگ میں اپنا جواب نہیں رکھتے، وہ غالب کی طرح مسائلِ تصوف کے بارے میں نہیں لکھتے اور فلسفیانہ خیالات کو نظم نہیں کرتے"[۱۵]

مومن عاشقانہ رنگ کی شاعری کے استاد مانے جاتے ہیں۔ ان کی اکثر غزلیات سوزِ محبت اور جذباتِ عشق سے بھری پڑی ہیں اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ مومن جہاں طلسمِ الفاظ، تخیل کی بلند پروازی اور معنی آفرینی میں محنت اور کاوش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں تراکیبِ نو کا اختراع بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی اکثر ترکیبیں کلام میں حُسن و ندرت کا باعث بنتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات یہی بندشیں کلام میں مشکلات بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ مومن کی اس تراکیبِ نو کی ایجاد کو کلیم الدین احمد نے پسند نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں :

"مومن نئی ترکیبوں کا اختراع محض اپنی قوتِ ایجاد دکھلانے کی غرض سے کرتے ہیں۔ اگر شاعر کے خیال انوکھے ہیں اور اگر اس کے جذبات میں ندرت ہے تو وہ بغیر قصد نئی نئی بندشوں پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن الفاظ کتنے ہی نادر کیوں نہ ہوں، استعارے کتنے ہی نایاب کیوں نہ ہوں، اگر صرف اپنے لیے اختراع کیے گئے ہیں تو لائقِ تحسین نہیں، اور مومن اکثر اس غلطی کے مرتکب ہو جاتے ہیں"[۱۶]

اشعارِ مومن

مضامین کے اعتبار سے مومن کا میدان زیادہ وسیع نہیں۔ انھوں نے اپنی غزل میں عاشقانہ مضامین کو سمویا ہے، اور عشق مجازی ہی ان کا محبوب موضوع ہے۔ مومن نے ہر جگہ توازن برقرار رکھا ہے اور تمثیل و عشق کے موضوع پر بارہا اشعار کہے ہیں اور عموماً شعرا کی طرح ہر جگہ عشق کو عقل پر فوقیت دی ہے۔ ان کے کلام میں روحانیت اور رومانیت دونوں پائی جاتی ہیں ــــــ مومن نے قطعات اور رباعیات بھی لکھی ہیں۔ قطعات کے موضوع مختلف ہیں، لیکن رباعیات میں رجحان مذہبی ہے ــــــ ان کے کلام کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جدید فارسی زبان کا اثر ان کے کلام پر مطلق نہ تھا۔ وہ کلاسیکل فارسی ہی میں لکھتے تھے۔ فارسی زبان کے ساتھ انھیں ایک طبعی مناسبت تھی اور تراکیب وضع کرنے میں ان کا انداز مجتہدانہ تھا۔

۱۵۔ اردو شاعری پر ایک نظر، ص ۱۷ ۱۶۔ ایضاً

(باقی آئندہ)